بشیر احمد ڈار

سقراط اور اس کا فلسفۂ اخلاق

(۲)

تاریخ فلسفہ کی کتابوں میں یہ بحث کی گئی ہے کہ آیا سقراط ایک فلسفی تھا یا محض اخلاقی مصلح اور دونوں گروہوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں دلائل پیش کئے ہیں۔ اگر اخلاقی مصلح سے مراد محض ایسا شخص ہو جو اپنے زمانے کے چند رسوم و تصورات کی اصلاح سے زیادہ کوئی کام نہ کرے تو یقیناً سقراط کا درجہ ایسے شخص سے بہت بلند و ارفع ہے اور اگر فلسفی سے مراد محض عقلی استدلال کی مدد سے چند بنیادی تصورات کے مضمرات کو واضح کرکے ایک نظام عقلی کی تعمیر ہے تو یقیناً سقراط فلسفی بھی نہیں کہلا سکتا۔ ڈاکٹر زیلر کے نزدیک ایک فلسفی کا مقام یہ ہے کہ وہ خالص علمی حیثیت سے عقلی اور اخلاقی مسائل کی چھان بین کرے لیکن اگر اسکے اس مرکز عمل سے عملی حیثیت سے اخلاقی اقدار کا چرچا ہو اور معاشرہ میں تبدیلی پیدا ہو تو اسکے خالص علمی مشاغل پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو ڈاکٹر زیلر کے نزدیک سقراط فلسفی کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ لیکن اگر اس اصول کو تسلیم کیا جائے کہ سقراط کا سارا مقصد محض علمی حیثیت سے چند تجریدی تصورات اور اعیان و نظریات کی تنقید اور مروجہ عقاید کے تناقضات کی توضیح تھا تو "اپالوجی" میں اس نے جس عظیم الشان مقصد کا ذکر کیا ہے جو اس کے ذمہ خود خدا نے سونپا تھا تو اس کی توجیہ مشکل سے ہو سکتی ہے۔ کیا وہ روحانی ذمہ داری جس کا احساس سقراط کو اتنا شدید تھا کہ موت کی سزا بھی اس کو اپنے ارادے اور تبلیغ حق سے باز نہ رکھ سکی محض ایک خشک فلسفہ کے عالم کے ساتھ کوئی مناسبت رکھتی ہے؟ حقیقت [illegible] یہ معلوم ہوتی ہے کہ سقراط ایک عظیم الشان مفکر، فلسفی، صوفی، درویش اور حیات نو کا پیغامبر تھا جس کے سامنے محض علمی و فکری کاوشیں اور مسائل نہ تھے بلکہ ایک انسانی معاشرے کی تشکیل نو کا اہم سوال تھا۔ وہ ایک ایسا معاشرہ تھا جس میں کچھ لوگ محض مادیت کی طرف راغب ہو چکے تھے، کچھ مشرکانہ عقائد و رسوم میں مبتلا جنہوں نے اپنی بداخلاقی کا جواز خود دیوتاؤں کی غیر اخلاقی زندگی کا نقشہ کھینچ کر مہیا کر دیا تھا۔ روحانی زندگی کو متزلزل کر دیا تھا۔ ان سب عقلی اور ذہنی گورکھ دھندوں کے ساتھ ساتھ سیاسی طور پر ایتھنز کی زندگی بکل زوال پذیر ہو چکی تھی۔ ایسے ماحول میں سقراط کا مقصد یہ اور صرف یہ تھا کہ لوگوں کے ذہن و قلب سے غلط معتقدات اور توہمات کا پردہ ہٹا دیا جائے، ان کے سامنے زندگی کے عملی مسائل کو ان کی پوری تابناکی سے پیش کیا جائے، تعصبات اور عصبیت کی بجائے ان کی عقل عام اور قلب و نظر سے اپیل کی جائے تاکہ حق و باطل کی تمیز وہ خود کر سکیں۔ اس نے استدلال کا تار و پود بکھیر کر ایک منظم اور اثباتی نظریہ حیات لوگوں کے سامنے پیش کیا جس کی روشنی میں وہ اپنے اخلاقی اور روحانی مسائل کو خود حل کرنے کی اہلیت پیدا کر سکیں۔ اس

مشکل کام میں اس کی نظر [illegible] اس فرض منصبی کی ادائیگی میں پورا [illegible] تھا۔ اس کی اپنی زندگی بالکل سادہ اور پاکیزہ تھی، وہ ہر قسم کی دنیاوی اور مادی کششوں سے بے نیاز تھا۔ ایک دفعہ اس نے ایک نمائش میں بے شمار چیزوں کو دیکھ کر کہا کتنی ہی چیزیں ایسی ہیں جن سے میں بے نیاز ہو کر زندگی بسر کر رہا ہوں۔ دولت، شہرت، عزت، سیاسی اقتدار اس کے سامنے [illegible] اور سب ہیچ تھیں [illegible] وہ صفات ہیں جو ایک حقیقی پیامبر کی زندگی کا طرۂ امتیاز ہو سکتی ہیں۔ اس کی زندگی کا مقصد علم و عمل، عقل و فکر [illegible] کی تطہیر تھا۔ اس لئے لوگوں کے ذہنوں سے صدیوں کے تعصبات کا بوجھ اتار پھینکا اور [illegible] کی روشنی سے ان کے ذہنوں کو منور کرنے کی کوشش کی۔ اس نے انکو [illegible] اعلیٰ اور بہتر زندگی کا تصور دیا جہاں ایک دانا ترین خدا کی عدالت میں ان کے [illegible] اعمال کا جائزہ لیا جانے والا ہے۔ ایسے تصور کے بغیر کسی بھی اخلاقی زندگی کی تعمیر ممکن نہیں

اس سلسلے میں ایک اور سوال بہت اہم ہے۔ عام طور پر سقراط کے متعلق مشہور ہے کہ اس کا [illegible] لاادریوں یا تشکیکیوں کا سا تھا [illegible] کی توجیہوں کی کہ اس کا [illegible] اپنا ہی علم [illegible] کے پاس ہے اور نہ ہی کسی کے پاس۔ لیکن اگر سقراط کی تمام [illegible] تشکیکیوں کی فہرست میں شامل کرنا بالکل غلط ہوگا۔ اگر اس کا مقصد [illegible] کی تنقید ہوتا، اگر اس کے سوالات کا مطلب محض لوگوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات [illegible] یقیناً [illegible] سقراط کی حیثیت سوفسطائی گروہ سے زیادہ نہ ہوتی اگرچہ اس [illegible] مشابہت سے لوگ سقراط کو سوفسطائی گروہ میں شامل کرنے پر آمادہ نظر آتے [illegible] اور نہ کوئی اس کا شاگرد، اس کا کام صرف یہ ہے کہ اپنے [illegible] اور اپنے آپ میں تحصیل علم کا جذبہ پیدا کرے۔ لاعلمی کا یہ اعلان یا جہالت کا اقرار علم [illegible] اس کا مطلب صرف دونوں کی ذہنی، قلبی اور داخلی زندگی کا مطالعہ اس کی [illegible] بہترین کی طرف ارتقائی جذبہ کا احساس پیدا کرنا ہے۔ اس کے ذہن میں [illegible] اس کی خواہش تھی کہ ان نظریات کو لوگوں کے [illegible] جہاں تک قدیم فلاسفہ طبیعات کا تعلق تھا [illegible] نتائج کو سامنے رکھ کر اعلان کیا کہ ان کے پاس علم حقیقت موجو[illegible] سوفسطائی گروہ نے انہی اختلافات کو بنیاد بنا کر صحیح علم کے وجود سے انکار کیا تھا [illegible] اس لاادریت کو ایک اصول بنا کر یہ فیصلہ کیا کہ ہر نظریۂ حیا[illegible] لوگوں کو تحصیل علم کی دعوت دیتا تھا، اس کے وجود کا مقر تھا۔

اِسی لئے اس نے اپنا اخلاقی نظریہ قائم کیا کہ صحیح علم ہی نیکی ہے اور جہالت بدی کے مترادف۔ اس نے موت کا سامنا کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ "غلطی کا ارتکاب کرنا خدائی یا انسانی حاکم مطلق کے احکام کی خلاف ورزی کرنا، میرے نزدیک ایک انتہائی شرمناک اور بدی کا فعل ہے۔" (اپالوجی ۲۹) یہ الفاظ کسی لاادری یا متشکک کے نہیں ہوسکتے، ان میں قطعیت اور یقین بالکل واضح اور نمایاں ہے۔

سقراط کے طریقۂ کار پر مختلف زمانوں میں اعتراضات ہوتے رہے ہیں نیٹشے نے سقراط اور افلاطون دونوں پر اعتراض کیا کہ ان کی وجہ سے حقیقی یونانی روح اور تمدن ہمیشہ کے لئے فنا ہوگئے۔ اس کا خیال تھا کہ سقراطی نقطۂ نگاہ سے یونانی فلسفہ پر زوال آیا اور یونانی روح بالکل غائب ہوگئی۔ ان کے خیال میں جذب وعشق کی بجائے عقل وفکر، زندگی کی ہمہ گیری کے مقابلہ میں اخلاق اور نیکی قابل ترجیح تھے۔ اُنہوں نے عالم آخرت کا نظریہ پیش کیا جو اس کی شہادت پر شکوک پیدا کئے، نیکی اور بدی کو مطلق مانا، اس مادی دنیا کے مقتضیات سے آنکھیں بند کرلیں اور اس طرح عیسائیت کے لئے راستہ ہموار کیا۔[1] یہی اس سے ملتی جلتی تنقید اقبال کے ہاں بھی موجود ہے۔ اس نے سقراط کی بجائے افلاطون کو منتخب کیا اور اس پر الزام لگایا کہ اس نے اس کائنات رنگ وبو کو تسخیر کرنے کی تعلیم دینے کی بجائے ایک عالم بالا وغیر مرئی کو حقیقی تسلیم کرانا چاہا:

راہب اوّل فلاطون حکیم　　از گروہ گوسفندانِ قدیم

ان تمام اعتراضات میں ایک چیز بالکل صحیح ہے کہ افلاطون نے اپنی کتاب ریپبلک میں جہاں سقراط کے ذہنی ارتقاء کا ذکر کیا اس میں لکھا ہے کہ اس نے طبعی فلاسفہ کے متضاد تصورات سے گھبرا کر فیصلہ کیا کہ جب تک انسان کے علم وعرفان کی بنیاد درست نہ ہو، محض خارجی کائنات کا علم اس کے قلب ونظر کی اصلاح نہیں کرسکتا۔ سقراط کے زمانے میں دو گروہ مشہور تھے۔ فلاسفۂ طبیعات اور سوفسطائی اور ان دونوں گروہوں کی علمی کاوشوں کا نتیجہ عملی طور پر اخلاقی اور مذہبی عقائد کی بیخ کنی کے سوا کچھ نہ تھا۔ طبعی فلاسفہ آخر کار خالص مادیت کے علمبردار ہوکر رہ گئے اور انکساغورس نے اگرچہ اصولِ نفس کو تسلیم کیا تھا لیکن کائنات کی تخلیق وارتقاء مختلف اشیاء کے وجود وعدم کی بحث کے دوران میں اس نے خالص طبعی اور مادی علل ہی پر بھروسہ کیا۔ سوفسطائی گروہ نے قدیم روایات وعقائد، اخلاقی اور روحانی اقدار، معاشرتی روابط اور خاندانی رشتوں کے بنیادی اصولوں کی تضحیک کرکے تمام یونانی معاشرے پر کلہاڑی چلادی۔ ایتھنز جیسی نازک عبوری دور میں جب کہ مسلسل لڑائیوں سے قوم کی ذہنی، اخلاقی اور اقتصادی حالت بالکل بگڑ چکی تھی سقراط نے ایک پیغمبرانہ شان سے اپنی قوم کے صالح افراد سے اپیل کی کہ وہ خارجی کائنات کی گتھیاں سلجھانے کی بجائے اپنے نفس کے حیوانی رجحانات

---

[1] دیکھئے مصنّف کی کتاب "اقبال اور فلسفۂ ارادیت" (انگریزی) صفحات ۲۴۰-۲۴۱

پر قابو پائیں، محض سلبی شکوک و اعتراضات میں الجھنے کی بجائے اپنی زندگی کے مثبت پہلوؤں پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔ سیاسی ریشہ دوانیوں اور مسلسل لڑائیوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے اپنی قوت روح اور نفس کی تربیت میں صرف کریں۔ اسے نہ خارجی دنیا کے مسائل کی اہمیت سے انکار تھا اور نہ وہ اپنے معاشرے کے سیاسی مفادات سے غافل۔ اس نے کئی جنگوں میں حصہ لیا اور تمام معاصری شہادتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس نے تمام فوجیوں کے مقابلہ میں زیادہ قوت برداشت، زیادہ بہادری اور جرأت، زیادہ استقلال اور پامردی کا ثبوت دیا۔ اس کا ذکر افلاطون نے "اپالوجی" میں خود سقراط کی زبان سے اور "سیمپوزیم" میں سقراط کے مختلف دوستوں اور خاص کر السیبیڈیز کی زبان میں تفصیل سے کیا ہے۔ ایسے حالات میں سقراط پر خارجی دنیا کے مسائل سے بے اعتنائی کا الزام یقیناً غلط ہے۔ نیٹشے چونکہ جمہوری نظام کے خلاف تھا اس لئے اس کے نزدیک سقراط کا آمرانہ نظام کی مخالفت یقیناً قابلِ اعتراض نظر آتا ہے لیکن یہی سقراط کی خوبی اور عقلی دوربینی کا ثبوت ہے۔ خود اقبال نے مغربی علوم پر جو تنقید کی ہے اگر اس کا غائر مطالعہ کیا جائے تو اس میں وہی نظریہ کارفرما نظر آئے گا جو سقراط کے ہاں پایا جاتا ہے:

علم اشیاء خاک مارا کیمیا ست — آہ در افرنگ تاثیرش جدا ست
آہ از افرنگ و از آئین او — آہ از اندیشۂ لادین او

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں:

علم را بے سوزِ دل خوانی شر است — نور او تاریکیٔ بحر و بر است
دل اگر بندد بہ حق پیغمبری است — ور ز حق بیگانہ گردد کافری است

اگرچہ کائنات خارجی کا علم جس سے انسان تسخیرِ فطرت کر لیتا ہے اپنی جگہ ضروری اور فائدہ مند ہے لیکن اس کے نتائج مغرب کی سرزمین میں اخلاقی اور روحانی زندگی کے لئے سراپا نقصان دہ ثابت ہوئے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس علم میں سوزِ دل موجود نہیں۔ یہی اور بالکل یہی اعتراض سقراط نے اپنے سے پہلے طبعی فلاسفہ کے کائناتی علم پر کیا تھا۔ ان کے تمام علوم کا سرمایہ خدا، روح، آخرت اور اخلاقی اقدار سے انکار تھا۔ معاشرتی زندگی کا توازن قائم کرنے کے لئے سقراط کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ اپنے ہم عصروں کے ذہن میں اس حقیقت کی اہمیت بٹھا دے کہ جب تک ان کی نگاہ میں پاکیزگی، ان کے قلب میں سوز، ان کے جذبات میں تربیت، ان کے دلوں میں روحانی اور اخلاقی اقدار کو قائم کرنے اور ترقی دینے کا ولولہ پیدا نہ ہوگا ان کے تمام علمی کارنامے فائدہ کی بجائے نقصان کا موجب ہونگے۔ انفس سے ہٹ کر محض آفاق کی طرف توجہ کرنے کا نتیجہ ہمیشہ انسان کے قلب و نظر کے لئے فساد کا باعث ہوئے ہیں۔ قدیم زمانے میں بھی اور آج بھی انفس سے بے پروائی اسی طرح انسان کی روحانی موت کی علت ہے جس طرح آفاق سے چشم پوشی۔ لیکن انفس سے ہٹ کر اور ماوراء ہو کر آفاق کی گہرائیوں میں اترنا بھی فائدہ مند نہیں۔ قوموں کی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے

والوں نے ہمیشہ پہلے اپنے نفسوں کی گہرائیوں میں ڈوب کر ہی حقیقت کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس حقیقت کی طرف قرآن کی مندرجہ ذیل آیت اشارہ کر رہی ہے :

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بہ انفسھم۔ — اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے نفسوں کی حالت کو نہ بدلیں۔

حضرت ابراہیم کا مشاہدۂ ملکوت السماء والارض یقیناً آفاقی تھا لیکن آفاقی تجربہ انفس کی تجربہ گاہ میں کیا گیا تھا۔ اگر اس روحانی تجربہ و مشاہدہ میں انفس اور آفاق دونوں کی گہرائیوں کی لطیف آمیزش نہ ہوتی تو اس سے وہ انقلاب ظہور پذیر نہ ہوتا جو حضرت ابراہیم کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ سقراط کا آفاق کو چھوڑ کر انفس کی طرف لوٹنا درحقیقت ایسے ہی معاشری انقلاب کی طرف پہلا قدم تھا۔

سقراط کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے روحِ انسانی کا بلند تصوّر جس میں موت کے بعد روح کی بقاء کا نظریہ بھی شامل ہے یونانی فکر میں واضح طور پر پیش کیا۔ ہم زرتشت کے فلسفۂ اخلاق کے بیان میں دیکھ چکے ہیں کہ یہی تصوّر اس کے ہاں بہت نمایاں طور پر موجود تھا اور اسی کے زیر اثر اسرائیلی عقائد میں داخل ہوا۔ ان نظریات سے مختلف قومیں متاثر ہوتی رہیں حتیٰ کہ ان قوموں میں بھی جو بعد میں خالص یونانی تہذیب کا جزو بنیں یہ تصورات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ ان میں فیثاغورثی اور آرفیسی نظام ہائے فکر کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں جن کے ہاں روح اور موت کے بعد ایک نئی زندگی کا تصوّر موجود تھا۔ ان ہی راستوں سے سقراط نے ان تصوّرات کو حاصل کیا اور پوری شدّت کے ساتھ ان کے مضمرات کی توضیح کی۔ سقراط کے زمانے میں طبعی فلاسفہ کی مقبولیت اور سوفسطائی گروہ کی کثرت سے روح اور حیات بعد الموت کے نظریات فراموش ہو چکے تھے اور لوگوں کی عملی زندگی میں مادیت اتنی سرایت کر چکی تھی کہ سقراط نے جب اپنے ہم عصروں کو ان مسائل کی طرف توجہ دلائی تو وہ حیران تھے کہ یہ شخص اتنا دقیانوسی ہے کہ ہمیں پھر قدیم بے معنی تصورات و نظریات کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ فیڈو میں سقراط کے مندرجہ ذیل الفاظ اس مسئلے پر پوری روشنی ڈالتے ہیں : "میرا خیال ہے کہ ہمارے صوفیاء کے اقوال بہت پُر معنی ہیں۔ وہ ہمیں مثالوں اور کہانیوں کے ذریعے ہمیشہ سمجھاتے رہے کہ ہر وہ شخص جو روحانی طور پر پاک و صاف ہوئے بغیر دوسری دنیا میں پہنچے گا وہ کیچڑ میں پھنسا رہے گا اور وہ جو پاک و صاف آئے گا وہ دیوتاؤں کی مجلس میں شامل ہونے کی عزّت حاصل کرے گا۔ . . . میں نے ساری عمر کوشش کی ہے اور کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تاکہ مجھے اس آخری لوگوں میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہو[1]۔ آیا میں نے صحیح راستے پر کوشش کی ہے اور کامیاب ہوا ہوں یا نہیں، اس کا علم مجھے بہت جلد ہو جائے گا، جب میں دوسری دنیا میں پہنچوں گا اگر خدا کو منظور ہوا۔ . . . . "

---

[1] والحقنی بالصالحین۔

جب سقراط اپنی گفتگو ختم کر چکا تو سیبیز نے کہا کہ میں تم سے اس معاملے میں متفق ہوں۔ لیکن عام لوگ روح کے متعلق تمہارے نظریے کو سُن کر شکوک و شبہات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جسم سے جُدا ہونے کے بعد وہ زندہ نہیں رہ سکتی بلکہ موت کے دن ہی وہ فنا ہو جاتی ہے .... تمہیں اپنی بات کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے کافی کوشش اور ترغیب اور اطمینان دلانے کی ضرورت ہے۔" (۶۹—۷۰)

آگے چل کر دوسری جگہ سقراط کہتا ہے: "کیا اب ہم یہ تسلیم کرلیں کہ روح جو غیر مرئی ہے اور جو انسان کی موت کے بعد ایسی جگہ جاتی ہے جو خود اس کی طرح شاندار، صاف اور غیر مرئی ہے اور جس کو صحیح طور پر روحانی یا غیر مرئی دُنیا کہا جاتا ہے، جہاں وہ نیک اور حکیم خدا کی معیت میں زندگی بسر کرتی ہے اور جہاں اگر خدا کی مرضی ہوئی تو میری روح بھی مکین ہو گی — کیا ہم یہ تسلیم کرلیں کہ روح جس کی فطرت اتنی شاندار، خالص اور غیر مرئی ہے، جسم کی موت کے بعد ہوا کے ذرّوں میں تحلیل ہو جاتی ہے اور فوراً ہی ہمیشہ کے لئے نیاً منیاً ہو جاتی ہے جیسا کہ عام لوگوں کا خیال ہے؟ نہیں میرے دوستو ایسا نہیں۔" (۸۰)

بلند اخلاقی اور روحانی زندگی کے قیام اور ارتقا کے لئے روح کے انفرادی وجود پاکیزہ و خدائی صفات سے متصف ہونا جسم کے ساتھ اتحاد کے ہوتے ہوئے بھی اس کی علیٰحدہ شخصیّت اور موت کے بعد اس کی مسلسل زندگی کے تصوّر لازمی اور ضروری ہیں۔ قرآن نے بار بار کفار کے اعتراضات کے جواب میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

ویقول الانسان ءاذا ما مت لسوف اُخرج حیّا۔ اولا یذکر الانسان انا خلقنٰہ من قبل ولم یک شیئاً۔

انسان پوچھتا ہے کہ جب وہ مر جائے گا تو وہ ضرور زندہ کرکے نکالا جائے گا؟ کیا وہ یاد نہیں کرتا کہ ہم نے پہلے اس کو پیدا کیا تھا حالانکہ یہ کچھ بھی نہیں تھا؟ (مریم - ۱۹ : ۶۶)

کما بدأنا اوّل خلق نعیدہٗ - وعداً علینا انا کنا فاعلین۔

جس طرح ہم نے اوّل بار پیدا کیا تھا اسی طرح ان کو دوبارا بھی پیدا کرینگے۔ (انبیاء - ۲۱ : ۴)

وقال الذین کفروا لا تاتینا الساعۃ قل بلیٰ وربی لتاتینّکم عالم الغیب لا یعزب عنہ مثقال ذرّۃ فی السماوات ولا فی الارض ولا اصغر من ذٰلک ولا اکبر الا فی کتاب مبین۔ لیجزی الذین آمنوا وعملوا الصالحات۔

آخرت سے انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ ہمارے لئے قیامت نہیں آئیگی۔ کہو مجھے اپنے پروردگار کی قسم جو عالم الغیب ہے ذرہ بھر آسمانوں اور زمین میں اس سے پوشیدہ نہیں، اور ذرّے سے چھوٹی اور بڑی سب چیزیں جس کے پاس کتابِ مبین میں درج ہیں۔ قیامت تو ضرور پیش آکر رہے گی تاکہ ایمان والوں کے لئے جنہوں نے نیک اعمال کئے خدا بدلہ دے۔ (سبا - ۳۴ : ۳)

واقسموا باللہ جھد ایمانھم لا یبعث اللہ

یہ لوگ اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اللہ کسی

من یموت علیٰ وعداً علیہ حقا ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔ لیبین لھم الذی یختلفون فیہ ولیعلم الذین کفروا انھم کانوا کاذبین۔

(۱۶: ۳۸-۳۹)

مرنے والے کو پھر سے زندہ کر کے نہ اُٹھائے گا، اُٹھائے گا کیوں نہیں یہ تو ایک وعدہ ہے جسے پورا کرنا اس نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ایسا ہونا اس لئے ضروری ہے کہ اللہ ان کے سامنے اس حقیقت کو کھولدے جس کے بارے میں یہ اختلاف کر رہے تھے اور منکرینِ حق کو معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹے تھے۔

سقراط کی زندگی کا مقصد اسی نظریۂ آخرت یا حیات بعد الموت کی تلقین تھا۔ چنانچہ فیڈو میں وہ کہتا ہے: "اگر روح لافانی ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی دیکھ بھال کریں نہ صرف اس دنیاوی زندگی کے دوران میں بلکہ آخرت کے لئے بھی۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس فرض سے غفلت اور بے پروائی کا نتیجہ کیا ہے۔ اگر موت سے مراد یہ ہے کہ انسان اس زندگی کے تمام اعمال نیک و بد کے ثمرات سے بالا ہو جاتا ہے تو یہ گویا بد اعمال انسانوں کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہو گی.... لیکن چونکہ آخرت کی زندگی یقینی ہے اور انسانی روح موت کے بعد زندہ رہے گی تو ایسی حالت میں نجات و فلاح کا یقینی راستہ یہی ہے کہ وہ حکمت و کمال کی تحصیل کرے کیونکہ اگلی دنیا میں سوائے اپنے اعمال کے روح اور کچھ نہیں لے جاتی۔" (۱۰۷)

"اپالوجی" میں ایک جگہ سقراط نے اس دُنیا کے مشاغل کے مقابلے میں آخرت کے اعمال کی اہمیّت کا ذکر کیا ہے، "اے میرے دوست، تم شہر ایتھنز کے باشندے ہو اور ایتھنز اپنی حکمت اور علمی کارناموں کے باعث بہت مشہور ہے۔ کیا تمہیں دولت جمع کرنے، شہرت حاصل کرنے اور عزّت پانے کی خواہش سے شرم نہیں آتی؟ کیا تمہارے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ حکمت اور سچائی کے حصول کے لئے تگ و دو کرنا اور اپنی روح کی تکمیل کے لئے سرگرداں ہونا بھی ضروری ہے! اگر کوئی شخص ان سوالات کے جواب میں یہ کہے کہ میں تو یہ کرتا ہوں تو میں اسے یونہی نہیں چھوڑ دیتا بلکہ میں اسے پوری طرح جرح کرتا ہوں تاکہ حقیقت کا انکشاف مجھ پر اور اس پر بھی ہو جائے۔ یہ کام میں ہر اس شخص سے کرتا ہوں اور کروں گا جو مجھے ملے گا.. کیونکہ مجھے خدا کی طرف سے اس کام کے کرنے کا حکم ہُوا ہے۔ میں اپنی ساری عمر اس کام میں صرف کرتا ہوں کہ ہر جگہ اور ہر شخص کو ذہن نشین کرا دوں کہ مقدم اور اوّلین کام یہ ہے کہ اپنی روحوں کی اصلاحِ حال اور تکمیل کی طرف توجہ دی جائے اور جب تک یہ کام سرانجام نہ ہو اسوقت تک اس دنیا کے کاموں یعنی جسمانی ضروریات اور دولت کی تحصیل کی طرف کوئی التفات نہ کیا جائے۔ اور یہ کہ نیکی دولت سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ دولت اور ہر وہ چیز جس کی خواہش لوگوں کے دلوں میں ہے سبھی نیکی کا ثمرہ ہیں۔" (۲۹، ۳۰) یہی وہ مفہوم ہے جو قرآن نے متعدد جگہ دنیا اور آخرت کے اعمال کا مقابلہ کرتے ہوئے ذکر کیا ہے:

ارضیتم بالحیاۃ الدنیا من الآخرۃ۔ فما

کیا تم نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا ہے؟

متاع الحیوٰۃ الدنیا فی الاٰخرۃ الا قلیل۔
(۹، ۳۸)

تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ دنیوی زندگی کا سروسامان آخرت میں بہت قلیل ہوگا۔

الذین یستحبون الحیوٰۃ الدنیا علی الاٰخرۃ ویصدون عن سبیل اللہ ویبغونھا عوجا اولٰئک فی ضلال بعید۔ (۱۴: ۳)

وہ لوگ جو آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی سے محبت کرتے ہیں، جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روک رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ راستہ ٹیڑھا ہو جائے، یہ لوگ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں۔

من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہٗ فیھا ما نشاءُ لمن نرید ثم جعلنا لہٗ جھنم یصلٰھا مذموماً مدحورا۔ ومن اراد الاٰخرۃ و سعیٰ لھا سعیھا وھو مؤمنٌ فاولٰئک کان سعیھم مشکورا۔ (۱۷: ۱۸-۱۹)

جو کوئی عاجلہ (یعنی دنیا) کا خواہش مند ہو اسے یہیں دے دیتے ہیں جو کچھ بھی جسے دینا چاہیں، پھر اس کے لئے جہنم ہے جسے وہ تاپے گا ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر۔ اور جو آخرت کا خواہشمند ہو اور اس کی مناسب سعی کرے اور وہ مومن ہو تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی۔

لیکن سقراط کے اخلاقی فلسفہ میں یہ سوال بہت اہم ہے کہ اس نے روح کا تصوّر کن تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے پیش کیا؟ اوپر سقراط کی ذہنی کش مکش کی تاریخ پیش کی جا چکی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طبعی فلاسفہ کی کوششوں سے متأثر نہ ہو سکا۔ نہ صرف ان کے متضاد بیانات بلکہ ان کے طریقۂ کار سے وہ بالکل مطمئن نہ تھا۔ اصل سوال یہ تھا کہ کائنات اور انسان کی صحیح ماہیت اور فطرت کا راز معلوم کرنے کے لئے کیا محض سائنٹیفک اور مادی نقطۂ نگاہ کافی ہے؟ مثلاً ایک مشین کے کام کی تشریح کرنے کے لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کی ہر حرکت ایک ماقبل حرکت کا نتیجہ ہے جو اس کی علّت کہی جاتی ہے۔ اس طرح یکے بعد دیگرے ہم علّت و معلول کی مسلسل کڑی قائم کرتے ہیں اور آخر میں ایک ایسا معلول نظر آتا ہے جہاں ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ اس معلول کی علّت اس مشین کے خارج سے عمل میں آئی اور اسی کے باعث حرکتوں کا یہ مسلسل تانتا بندھا ہوا چلتا رہتا ہے۔ ہم گھڑی کو چابی دیتے ہیں اور اس کے تمام پُرزے حرکت میں آجاتے ہیں اور اس طرح گھڑی اپنا کام سرانجام دئے چلی جاتی ہے۔ اسی اصول کی روشنی میں جب نشوونما پانے والی چیزوں کی داخلی حرکت کی تشریح کی ضرورت ہوتی ہے تو سائنٹیفک طریقہ کار یہ ہے کہ اس کی ابتدائی حالت کا کھوج لگایا جائے۔ مثلاً مذہب کی تشریح کرنے کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ معلوم ہو جائے کہ اس کا آغاز کیسے ہوا۔ اس سوال کو حل کرنے کے لئے قدیم انسانوں کی زندگی کا مطالعہ کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ قوائے فطرت کی ہولناکیوں کا شکار تھا۔ باد و باراں، موت و بیماریاں، قحط اور لڑائیاں ہر طرف سے اس کے ذہن پر خوف و ہراس پیدا کرتی تھیں۔ انہی خوفناک قوتوں کو اس نے دیوتاؤں کا نام دیا اور اسی خوف کی بنیاد پر اس کے مذہبی تصوّرات کی تعمیر قائم ہوئی اور یہی خوف، تنہائی اور بچاؤ کے جذبات آج بھی انسان کو مذہب کی طرف مائل کئے ہوئے ہیں۔ فرائڈ کی ساری علمی کاوشوں کا مقصد یہی ہے کہ مذہب کی تعلیم

اور حرمت کو ایسے ہی حیوانی اور جبلّی جذبوں کے نام پر قربان کر دے۔ یہی وہ سائنسی یا مادی طریقہ تشریح تھا جس کو سقراط کے ماقبل طبعی فلاسفہ نے حقیقت کا راز معلوم کرنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ جب سقراط کے ذہن میں کائنات کبریٰ و صغریٰ، انفس و آفاق، کے مختلف رازوں کو معلوم کرنے کا شوق بیدار ہوا تو اس نے ان فلاسفہ کا مطالعہ شروع کیا لیکن اسے معلوم ہوا کہ ان کے جوابات سے اسے بالکل تشفی نہ ہوئی۔ اس لئے کہ وہ ان مسائل کو خالص سائنسی نقطہ نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے 'کیوں' کی بجائے 'کیسے' کا جواب تلاش کیا تھا اور اس طرح انہوں نے کائنات کی ماہیت بیان کرنے کے لئے ہوا، آگ، یا مٹی کو اوّلیں بنیاد قرار دیا۔ یہ کائنات کیوں پیدا ہوئی؟ تو اس کا جواب ان کے پاس صرف یہ تھا کہ پہلے پہل ایک طرح کا مادہ تھا جس کی مختلف قسم کی آمیزش سے اس مادی کائنات کا ظہور ہوا لیکن جب اس پریشانی میں سقراط کو انکساگورس کے متعلق معلوم ہوا کہ اس نے کائنات کی تشریح کرتے ہوئے "نفس" کا ذکر کیا ہے تو اسے اپنے سوال کا جواب پانے کی توقع ہوئی اور وہ سوال 'کیسے' نہیں بلکہ 'کیوں' تھا۔ جب تک کسی ایسی ہستی کا اقرار نہ کیا جائے جو انسان کی طرح کسی خارجی اثر سے بے نیاز ہو، تب تک اس کے کیوں کا جواب ممکن نہیں۔ لیکن سقراط کو انکساگورس کی کتابوں کے مطالعہ سے مایوسی ہوئی۔ اس مایوسی کی وجہ یہ تھی کہ انکساگورس نے نفس کے اصول کو تسلیم تو کیا تھا لیکن اس کے باوجود کائنات کی تشریح کرتے ہوئے خالص مادی اور میکانکی اصول علت و معلول سے کام لیا تھا۔ نفس یا ذہن کا کام صرف یہ تھا کہ اس کے باعث ازل میں کسی ایک خاص وقت اس نے کائنات میں خارج سے ایک حرکت پیدا کر دی اور بس۔ اس مایوسی کے بعد سقراط کے لئے اب ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا توحیدی نظریۂ حیات۔ اس کے نزدیک یہ کائنات بلا مقصد پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس کے بنانے والا ایک دانا و حکیم خدا ہے جس کا ہر کام بہترین اور ہر عمل ایک خاص مدعا مقصد کے حصول کے لئے ہے۔ یہی وجہ تھی جس کے باعث اس نے اپنے ہم عصروں کی توجہ طبعی علوم سے ہٹا کر نفس انسانی کی طرف مبذول کرانی چاہی کیونکہ نفس انسانی ہی وہ حقیقت ہے جس کی روشنی میں وہ کائنات کی تخلیق کے راز سربستہ کو سمجھ سکتا ہے اور جس کے سمجھنے کے بعد اس کی اپنی اور دوسرے انسانوں کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ ان دو راستوں کے فرق کو رومی نے مندرجہ ذیل اشعار میں بیان کیا ہے:

دفتر صوفی سواد و حرف نیست　　جز دل اسپید مثل برف نیست
زاد دانش مند آثارِ قلم　　زاد صوفی چیست آثارِ قدم

ایک طرف دانش مند ہے جو مادی علوم کے اکتساب کے بعد علم و حکمت کے دفتر پر دفتر تیار کرتا ہے۔ دوسری طرف صوفی ہے جس کے پاس قلم ہے اور نہ دوات، اس کی ساری پونجی ایک دل دردمند اور ایک جذبہ بلند ہے اور جو اپنے مقصد کی تلاش میں قدموں کے آثار پر چل نکلتا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے ان راستوں کے تضاد کو اپنے مزاحیہ انداز میں خوب بیان کیا ہے:

ڈارون بولا یوز نہ ہوں میں　　منصور بولا خدا ہوں میں

ایک سائنس دان جس کا دین محض مادی سلسلۂ علت و معلول کے اندر محدود ہے، اس کائنات کی تخلیق کا راز معلوم کرنے کے لئے آغاز کی طرف جاتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ انسان اس دنیا میں بندر کی حیوانی شکل سے بدل کر انسانی شکل میں آیا اور اس لئے وہ حیوانی صفات کا مجموعہ ہے۔ لیکن سقراط جیسے شخص کی نگاہ میں یہ جواب بالکل بے معنی ہے۔ اس کے سامنے سوال یہ تھا کہ انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے اور اس لئے وہ اس کے انجام کار کی طرف دیکھتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ انسان خدائی صفات کا حامل ہے، وہ خدا کو اپنے قابو میں لانا چاہتا ہے، وہ خود ایک چھوٹے پیمانے پر خدا ہے۔ رومی نے کیا خوب کہا ہے:

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند　　فرشتہ صید و پیر شکار و یزداں گیر

اسی تضاد کو اقبال نے مندرجہ ذیل شعر میں واضح کیا ہے:

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے　　کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں کہ میری انتہا کیا ہے

سقراط نے انسانی روح کی اہمیت تسلیم کر کے اس سائنسی طریقہ کار کی جگہ غائتی طریقہ کو رواج دیا اور اس طرح روحانی اور اخلاقی زندگی کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔ اس کے خیال میں کسی انسانی فعل کی تشریح کے لئے یہ کافی نہیں کہ خارجی عوامل اور اثرات کا ذکر کر دیا جائے بلکہ ان مقاصد اور نصب العینوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جن کے حصول کے لئے وہ سرگرم عمل ہے۔ اس اصول کی روشنی میں انسانوں کی بے لوث قربانیاں محض جبلّی اقتضاؤں کا اظہار نہیں بلکہ بلند روحانی فطرت کے دھندلے نقوش کے نامکمل مظہر ہیں حتیٰ کہ معمولی سے معمولی اور ادنیٰ سے ادنیٰ طبعی افعال بھی اسی غائتی نظریئے کی روشنی میں کسی روحانی مقصد کے حصول کا ذریعہ تصوّر کئے جائیں گے۔

فکرِ اقبالؒ

(از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم)

یہ بلند پایہ تصنیف اقبالیات میں گراں قدر اضافہ ہے۔ جس میں حضرت علامہ اقبالؒ کی شاعری اور فلسفہ کے ہر پہلو کی نہایت دلنشیں اور حکیمانہ انداز میں تشریح کی گئی ہے۔ قیمت دس روپے۔

ملنے کا پتہ: منیجر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور